The Meaning and Application of ‘*Ilm al-I‘tibār* in the Light of Verses on Domestic Management: A Comparative Study of *Ilhām al-Raḥmān* and *Bayān al-Qur’ān*

Muhammad Waqas[❁]
Taj Afsar[❁]

ABSTRACT

The Qur’ān is considered an abiding code of life by majority of Muslims. However, the principles of its interpretation have always been the subject of critical discussion among scholars. This explains why we see multiple interpretations of a single verse by different commentators. Two of these personalities from twentieth century, Maulānā ‘Ubaid Allāh Sindhī and Maulānā Ashraf ‘Alī Thānvī, have also interpreted the Qur’ān in the light of their own exegetical principles. One clear disagreement between them stems from interpreting the Qur’ān using the principle of ‘*Ilm al-I‘tibār*. Whereas Maulānā Thānvī

❁ Ph.D Scholar, Department of Tafseer & Quranic Sciences, Faculty of Islamic Studies (Usuluddin), International Islamic University, Islamabad. (muhammadwaqasiiui@gmail.com)

❁ Associate Professor, Head of Department, Tafseer & Quranic Sciences, Faculty of Islamic Studies (Usuluddin), International Islamic University, Islamabad. (ibnefalah@gmail.com)

uses this principle to address problems related to individual moral purification and enhancement, Maulānā Sindhī employs it to deduce solutions to problems related to affairs of a state. This article aims to present a comparative analysis of how the two scholars use ʻ*Ilm al-Iʻtibār* to deduce implications from the Qur'ānic verses for domestic matters.

علم الاعتبار کا مفہوم و اطلاق، آیات تدبیر منزل کی روشنی میں:
تفسیر الہام الرحمان اور بیان القرآن کا تقابلی مطالعہ

محمد وقاص ۞
تاج افسر ۞

تمہید

اللہ تعالی نے انسانوں کی رہ نمائی کے لیے انبیا علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا جس کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا، البتہ وہ ایک ایسا دائمی ضابطہ حیات لے کر آئے ہیں جو تا قیامت انسانوں کی رہ نمائی کرتا رہے گا۔ اس کی تعبیر و تشریح کے لیے ہر دور میں ایسے اہل علم پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس دائمی ضابطہ حیات سے انسانیت کے لیے رہ نمائی اخذ کر سکیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب بعض اقوال میں بھی اس کے اشارات موجود ہیں۔(۱) شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (م ۱۷۶۲ء) بھی علما کی اسی سلسلۃ الذھب کی ایک نمایاں کڑی ہیں، جن کی اجتہادی آرا زندگی کے تمام شعبوں میں قابل تحسین سمجھی جاتی ہیں؛ خواہ تزکیہ نفس ہو یا اجتماعی امور، خاندانی امور ہوں یا معاشی امور، ملکی معاملات ہوں یا بین الاقوامی تعلقات، ان سب امور میں رہ نمائی شاہ صاحب کی جلالت علمی اور بصیرت پر دال ہے۔ برصغیر کے تمام علمی حلقے بلا واسطہ یا بالواسطہ شاہ صاحب سے متاثر اور ان کے علمی فیوض کے مداح بھی ہیں۔ قرآنیات کے باب میں شاہ صاحب کی خدمات **فتح الرحمان في ترجمة القرآن، المقدمة في قوانين**

۞ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ تفسیر و علوم القرآن، کلیہ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
(muhammadwaqasiiui@gmail.com)
۞ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ تفسیر و علوم القرآن، کلیہ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
(ibnefalah@gmail.com)

۱۔ ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے علم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالی اس امت کے لیے ہر سو سال کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے لیے دین کی تجدید کرے“۔ ابو داؤد السجستانی، **سنن أبي داؤد**، كتاب الملاحم، باب ما يذكر فى قرن المائة (بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۹۶ء)، ۳: ۱۱۳۔

الترجمة، تاويل الأحاديثاور **الفوزالكبير في أصول التفسير** کی صورت میں آج بھی سب کے لیے نشان منزل کا کام دیتی ہیں۔ شاہ صاحب کے بعد اسی سلسلۃ الذھب کی دو بڑی شخصیات مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۴ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۳ء) کی قرآنی فکر کو برصغیر میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

علم الاعتبار کے حوالے سے دونوں بزرگوں کی فکر میں مماثلت بھی ہے اور اختلاف بھی۔ مماثلت یہ کہ دونوں قرآن پاک کی آیات کے ضمن میں اعتبار و اشارات بیان کرتے ہیں۔ اور اختلاف یہ کہ مولانا تھانوی اس کا دائرہ کار فرد کی اخلاقی اصلاح تک محدود رکھتے ہیں جب کہ مولانا سندھی معاشرتی مسائل کا استنباط بھی علم الاعتبار کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اس لیے اس مقالے میں ہم نے شاہ ولی اللہ صاحب کی **حجة الله البالغة** سے "مبحث ارتفاقات" میں سے دوسرے ارتفاق "تدبیر منزل" کو بنیاد بنا کر ان دونوں بزرگوں کے اعتبارات کی روشنی میں ایسی آیات کا تقابلی جائزہ لیا ہے جو گھریلو امور سے متعلق ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت دو پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ ثقافتی تغیر و تبدل کے نتیجے میں ہماری معاشرتی زندگی مسلسل ارتقا پذیر ہے، اس لیے قرآن پاک کے اشارات کی روشنی میں موجودہ حالات میں قرآنی تعلیمات کو سمجھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ کہ مولانا سندھی کے طرز تفسیر میں علم الاعتبار کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور انھوں نے اپنے نتائج فکر تفسیر **المقام المحمود**[۲] (اردو امالی) اور **إلهام الرحمان في تفسير القرآن** (عربی امالی) کی صورت میں پیش کیے ہیں۔ اسی طرح مولانا تھانوی نے بھی اپنی تفسیر **بیان القرآن** میں آیات سے مستنبط اشارات علاحدہ عنوان دے کر نقل کیے ہیں۔ مولانا تھانوی کو مولانا سندھی کے اس طرز تفسیر پر شبہات تھے، جس پر انھوں نے ایک رسالہ **التقصير في التفسير** لکھا، اور مولانا سندھی اور ان

۲۔ **تفسیر المقام المحمود** مولانا عبید اللہ سندھی کے اردو امالی کا مجموعہ ہے، جس کا سلسلہ مولانا سندھی نے ادارہ نظارۃ المعارف دہلی میں شروع کیا تھا، جس کا ابتدائی حصہ سورۃ بقرہ سے سورۃ توبہ تک فیروز نامی ایک صاحب نے قلم بند کیا، اس کا باقی حصہ مولانا عبداللہ بن نہال احمد نے ۱۳۵۳ھ میں جب وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے، وہیں سن کر نقل کیا۔ بعد ازاں ابتدائی حصہ بھی مولانا سندھی نے دوبارہ املا کروایا کہ شاید کوئی نکتہ رہ نہ گیا ہو۔ مولوی نور الحق راشد کے ہاتھ سے لکھا ہوا **المقام المحمود** کا یہ مخطوط ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کی ملکیت ہے، اور ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری میں موجود ہے۔

کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوری (م ۱۹۶۲ء) کے طریقہ تفسیر اور بعض نتائج فکر پر تنقید کی۔ مولانا تھانوی کا خیال تھا کہ الاعتبار کا استعمال صوفیا ہی کرتے ہیں، علماء ظاہر میں وہ طریق مسلوک نہیں ہے۔[۳] جب کہ مولانا سندھی صرف تزکیہ نفس ہی نہیں بلکہ معاشی اور اجتماعی امور کا استنباط بھی علم الاعتبار کی روشنی میں کرتے ہیں، جس کی طرف مولانا ابوالحسن علی ندوی (م ۱۹۹۹ء) نے بھی اشارہ کیا ہے:

وكان له مذهب في تفسير القرآن، يستنبط منه دقائق السياسة العصرية، والمذاهب الاقتصادية، ويتوسع في الاعتبار والتأويل، وقد تخرج عليه في هذا الأسلوب من التفسير بعض كبار العلماء الذين نفع الله بهم خلقًا كثيرًا، أشهرهم الشيخ أحمد علي اللاهوري، وقد انتقد على هذا الأسلوب الشيخ أشرف علي التهانوي، وألف رسالة سماها **التقصير في التفسير**.[۴]

(اور ان (مولانا عبید اللہ سندھی) کا قرآن کی تفسیر میں ایک مخصوص طریقہ تھا، جس کے ذریعے سے وہ معاصر سیاسی مسائل، اور اقتصادی نظام کے دقیق مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے۔ اور **الاعتبار و التاویل** میں توسع کے قائل تھے۔ اور بعض اہل علم جن سے اللہ نے مخلوق کو بہت فائدہ پہنچایا، ان سے اسی طرز پر تفسیر پڑھی تھی، جن میں مشہور شیخ احمد علی لاہوری ہیں۔ اور ان کے اس تفسیر کے طریقہ پر شیخ اشرف علی تھانوی نے تنقید فرمائی اور ایک رسالہ **التقصير في التفسير** کے نام سے لکھا۔)

خود مولانا سندھی سورۃ المجادلہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قرآن حکیم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ اجتماعی سیاسی امور کے سمجھانے کے لیے گھریلو واقعات کو عنوان بناتا ہے، کیوں کہ عرب اپنے گھر پر حاوی تھے۔ اگر ملک کو ایک بڑا گھرانہ فرض کر لیا جائے، تو جو اصول تدبیر منزل میں کام دیتے ہیں، وہی تدبیر ملک میں کام دے سکتے ہیں۔[۵]

اس لیے ان دونوں صاحبان علم کی آرا کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے تا کہ علم الاعتبار کی افادیت کا جائزہ لیا جا سکے اور مولانا تھانوی کے شبہات کی روشنی میں مولانا سندھی کے نتائج فکر کی عملی افادیت کو پرکھا جا سکے۔

اس بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں "تدبیر منزل" اور "علم الاعتبار" کی اصطلاحات کا تعارف مذکور ہے۔ دوسرے حصہ میں تفسیر **الہام الرحمان** اور **بیان القرآن** کا تعارف مذکور ہے۔ اور

۳- مولانا اشرف علی تھانوی، **مسائل السلوک من کلام ملک الملوک** (دہلی: مالک کتب خانہ، ۱۹۱۹)، ۳۔

۴- عبدالحی الحسنی، **نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر** (بیروت: دار ابن حزم، ۱۴۲۰ھ)، ۸: ۱۳۰۲۔ نوٹ: **نزهة الخواطر** کی آٹھویں جلد اس کتاب کا تکملہ ہے، جو کہ ان کے فرزند الشیخ ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔

۵- عبید اللہ سندھی، **قرآنی شعور انقلاب** (لاہور: مکی دار الکتب، ۱۹۹۹ء)، ۱۶۷۔

بحث کے تیسرے حصہ میں تدبیر منزل سے متعلق آیات کے ضمن میں دونوں صاحبان علم کی آرا کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آخر میں نتائج بحث ذکر کیے ہیں۔

تدبیر منزل اور اصول اعتبار

اس بحث کے اندر تدبیر منزل اور اصول اعتبار کی اصطلاحات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تدبیر منزل

شاہ ولی اللہ صاحب نے تدبیر منزل کو دوسرے ارتفاق کے تحت بیان کیا ہے۔ عربی میں ارتفق به کا مطلب ہوتا ہے: نفع اٹھانا۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ آسائش سے زندگی بسر کرنے کی مفید تدبیریں۔ مولانا سندھی اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ارتفاق کا مادہ "رفق" ہے، جس کے معنی نرمی یا نرمی سے کام لینے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے فائدے کی جتنی چیزیں ہیں، وہ کائنات میں موجود تو ہیں، لیکن وہ انسان کے خود بخود کام نہیں آتیں۔ وہ "سرکش" اور "باغی" ہیں۔ انسان کو انہیں رام کر کے نرمی کے ساتھ کام لینا پڑتا ہے ایسے ہی دنیا پر سوچ بچار کرنے کے سلسلے میں جو مشکل گھتیاں سامنے آتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ سوچنے ہی سے کھلتی ہیں۔[۶]

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کے چار مراحل بیان کیے ہیں۔ پہلے مرحلے میں انسان جب حیوانیت سے اوپر اٹھ کر انسانیت میں داخل ہوتا ہے تو وہ پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات بنا کر رہتا ہے، جن میں کاشت کاری، چند برتنوں کا استعمال، زبان کا استعمال، لباس اور مکان کا استعمال کرتا ہے اور تعین زوجہ کرتا ہے، اس منزل میں اس کی تخلیقات میں صفائی اور حسن کم ہوتا ہے، اسے امام صاحب ارتفاق اول (The First Stage of Human Culture) قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بڑے بڑے قصبات آباد کرتا ہے اور ارتفاق اول کی چیزوں میں صفائی اور حسن کا اضافہ کرتا ہے، اسے ارتفاق دوم قرار دیتے ہیں۔ اس سے آگے ترقی کر کے وہ معاشرے میں نظام حکومت قائم کرتا ہے، یہ ارتفاقات کی تیسری منزل ہے. جب وہ سیاسی قوموں میں بٹ گیا اور خون ریزیاں ہونے لگیں تو بین الاقوامی حکومتیں قائم ہونے لگیں، تاکہ قوموں کو ان خونریزیوں سے روکا جائے، اور یہ ارتفاق کی چوتھی منزل ہے۔[۷]

۶۔ عبید اللہ سندھی، **اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ** (کراچی: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، ۲۰۱۰ء)، ۲۳۹۔

۷۔ شاہ ولی اللہ، **حجة الله البالغة**، مبحث الارتفاقات، باب كيفية استنباط الارتفاقات (**بیروت**: دارالجیل، ۲۰۰۵ء)، ۱: ۸۲– ۸۵۔

تدبیر منزل کو عربی میں التدبیر المنزلی کہتے ہیں۔ یعنی گھریلو امور کو حسن انتظام سے چلانا۔ تدبیر منزل کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:"وهو الحكمة الباحثة عن كيفية حفظ الربط الواقع بين أهل المنزل على الحد الثاني من الارتفاق وفيه أربع جمل: الزواج، والولادة، والملكة، والصحبة."[۸] (اور تدبیر منزل: وہ حکمت عملیہ ہے جو ارتفاق کے دوسرے درجہ پر ایک گھر کے باشندوں میں پائے جانے والے ربط و تعلق کی نگہداشت کی کیفیت سے بحث کرنے والی ہے۔ اور اس فن میں چار مباحث ہیں: ازدواج، ولادت، ملکیت اور رفاقت۔)[۹]

یعنی وہ علم ہے جو ترقی یافتہ تمدن میں، خاندانی تعلقات کی نگہداشت سے بحث کرتا ہے۔ یعنی اس فن میں ان مصلحتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق ایک گھر میں بسنے والے افراد کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس فن کا خلاصہ چار مسائل ہیں: پہلا مسئلہ شادی بیاہ سے متعلقہ امور جیسے: منگنی، نکاح، ولیمہ وغیرہ کے طور طریقے اور رسوم ، رشتہ زوجیت میں کفو کا اعتبار، زوجین کے حقوق، محرمات کا بیان، گھر میں مرد کی قوامیت اور معاشی امور میں عورت کی کفالت، طلاق اور عدت وغیرہ کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ دوسرے مسئلے میں والدین اور اولاد کے درمیان حقوق و فرائض سے متعلق امور پر بحث کی جاتی ہے۔ تیسرے مسئلے میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ خواہ وہ گھر میں ہوں یا کاروبار زندگی کے دوسرے امور میں ایک دوسرے کے حقوق و فرائض سے بحث ہوتی ہے، کیوں کہ یہ فطری امر ہے کہ سارے انسانوں کو فطری صلاحتیں ایک جیسی نہیں ملی اوران میں استعداد کا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے انسان اپنے کاروبارِ حیات میں ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ چوتھا مسئلہ صحبت و رفاقت کا ہے۔ انسان چوں کہ مدنی الطبع ہے، اس کی فطرت میں مل جل کر رہنے کا جذبہ ہے، اس لیے صحبت و رفاقت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، یعنی آپس میں رشتہ الفت و مودت قائم کرنا تاکہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ اس لیے اولاد پر خرچ کرنا، ماں باپ پر خرچ کرنا، غریبوں اور محتاجوں کو دینا، وراثت کی تقسیم کا قانون بیان کرنا وغیرہ اہم امور زیر بحث آتے ہیں۔

علم الاعتبار

لغت میں لفظ اعتبار عبر سے مشتق ہے جو کئی معانی کے لیے مستعمل ہے، لیکن سب میں امر مشترک یہ ہے

۸- نفس مرجع، باب تدبیر المنزل، ۱: ۹۷۔

۹- سعید احمد پالن پوری، **رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغۃ** (کراچی: زم زم پبلشرز،۲۰۰۵ء)،۱: ۴۵۲۔

کہ ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا، جیسے ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: "تفسیر بیان کرنا اور خواب کو اس کی حقیقت کی طرف لوٹانا۔ اسی سے لفظ عبر ہے جو جمع ہے عبرت کی، یعنی جس سے انسان نصیحت حاصل کرتا ہے۔"[۱۰]

اسی سے لفظ عبارات بھی ہے اور اعتبار بھی۔ امام رازی لکھتے ہیں: "وسميت الألفاظ عبارات، لأنها تنقل المعاني من لسان القائل إلى عقل المستمع... قال المفسرون: الاعتبار هو النظر في حقائق الأشياء وجهات دلالتها ليعرف بالنظر فيها شيء آخر من جنسها"[۱۱] (الفاظ کے مجموعے کو عبارات بھی کہتے ہیں؛ کیوں کہ وہ معانی کو بولنے والے کی زبان سے سننے والے کے دماغ کی طرف منتقل کر دیتی ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اعتبار اشیا کی حقیقت اور ان کی دلالت کی جہات میں نظر کرنے سے عبارت ہے تاکہ ان کو دیکھ کر ان کی جنس کی دوسری اشیا کی معرفت حاصل ہو۔)

قرآنی آیات کے وہ معانی جو آیات کا مدلول تو نہیں ہوتے اور نہ ہی جن آیات کے تحت بیان کیے جا رہے ہوں ان سے ثابت ہوتے ہیں، بلکہ ان کا ثبوت دیگر دلائل شرعیہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان معانی کی آیات سے ذوقی یا مآلی نسبت کی وجہ سے بہ طور لطائف و اسرار بیان کیے جاتے ہیں۔ گویا کہ قرآن کی ایک نظیر سے دوسری نظیر کا استحضار کیا جاتا ہے۔ یعنی اعتبار کو ہم قرآن کی تفسیر تو نہیں کہہ سکتے البتہ اس کی حیثیت دین میں مقصود کی ہے جو اس کے علاوہ دیگر شرعی دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔

اس کی شرعی دلیل خود شاہ ولی اللہ صاحب نے **الفوز الکبیر** میں بیان فرمائی ہے:

> نبی پاک نے خود فن اعتبار کو معتبر گردانا ہے، اور آپ نے یہ راہ اپنائی ہے، تاکہ وہ علماے امت کے لیے سنت بن جائے، اور ان کے علوم وھبیہ کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ ہو جائے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد خداوندی "فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى" سے تقدیر کے مسئلے میں استدلال کیا ہے،[۱۲] اگرچہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو یہ کام کرے گا ہم اس کو جنت اور

۱۰- ابن منظور افریقی، **لسان العرب** (بیروت: دار صادر، ۱۴۱۴ھ)، ۴: ۵۲۹- ۵۳۰۔

۱۱ - فخر الدین الرازی، **مفاتیح الغیب** (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۴۲۰ھ)، ۲۹: ۵۰۴۔

۱۲- عن علي رضي الله عنه قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في بقيع الغرقد في جنازة، فقال: "مامنكم من أحد إلا وقد كتب مقعده من الجنة، ومقعده من النار"، فقالوا: يا رسول الله أفلا نتكل؟ فقال: "اعملوا فكل ميسر" ثم قرأ: {فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنى} [الليل:۶] إلى قوله {للعسرى} [اللیل:۱۰]۔ محمد بن اسماعیل البخاری، **صحيح البخاري**، كتاب تفسير القرآن، باب قوله فأما من أعطى واتقى (بیروت: دار طوق النجاة، ۱۴۲۲ھ)، ۶: ۱۷۰۔

نعمت کا راستہ دکھائیں گے، اور جو ان کاموں کی ضد کو اپنائے گا ہم اس کے لیے آگ اور عذاب کا راستہ کھول دیں گے، لیکن اعتبار کے طور پر جانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہر ایک کو خاص حالت کے لیے پیدا فرمایا ہے، اور اللہ تعالی اس پر وہ حالت جاری فرماتے ہیں، چاہے وہ جانے یا نہ جانے، پس اس اعتبار سے اس آیت کریمہ کا گہرا ربط ہے تقدیر کے مسئلے کے ساتھ۔[۱۳]

ڈاکٹر شیر علی شاہ(م ۲۰۱۵ء) مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد رشید اور اپنے استاد مولانا احمد علی لاہوری سے الاعتبار والتاویل کا مفہوم نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تاویل، اول سے مشتق ہے، اول بمعنی رجوع کردن، رجوع کرنا ہے، اور مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر بالتاویل سے یہ مراد ہے کہ قرآن کریم کی آیات محتملہ کی ایسی تفسیر کی جائے جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مخالف نہ ہو، گویا تفسیر بالاعتبار والتاویل سے مراد ہے قرآن مجید میں جو حالات وواقعات مذکور ہیں ان کو اپنے اوپر چسپاں کرنا اور اس آئینے میں اپنا منہ دیکھنا کیوں کہ اول کے معنی رجوع کرنا یعنی کتاب اللہ کو اپنی طرف رجوع کر کے لانا ہے کیوں کہ قرآن کا صحیح فائدہ اور مقصودی چیز اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ اس کی مثال انھوں نے یوں دی کہ اگر سورۃ الفیل کی تفسیر بیان کریں تو مکمل واقعہ ابرہہ شاہ حبشہ کا سنانے کے بعد یوں کہا جائے کہ اس سورت کا عنوان اور موضوع یہ ہے کہ توہین شعائر اللہ سے ذلت لازمی ہے تو اب عوام کو یہ معلوم ہو گا کہ جو کوئی بھی شعائر اللہ کی توہین کرے گا وہ ذلت اور رسوائی میں مبتلا ہو گا، گویا اب یہ بات ایک قانون کی شکل میں ہر اس شخص پر منطبق ہو گی جو شعائر اللہ کی توہین کر رہا ہو۔ اب آپ پوری بصیرت کے ساتھ یہ عنوان اس سورت پر منطبق کر سکتے ہیں کہ "توہین شعائر اللہ سے ذلت لازمی ہے" اسی کو تفسیر بالاعتبار والتاویل کہتے ہیں۔[۱۴]

مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ صاحب کی بات کو ہی آگے بڑھایا ہے جو انھوں نے **الفوز الکبیر** میں سبب نزول کی بحث کرتے ہوئے بیان کی ہے۔ کہ متقدمین نے ہر آیت کا سبب نزول بیان کر کے آیت کے معنی کو خاص کر دیا، جب کہ قرآن کے اندر عمومیت ہے، جس کا انطباق ہر جگہ ہو گا۔ اسی لیے مولانا سندھی نے اعتبار کا طریقہ اختیار کیا تا کہ آیات کے عمومی معنی سے عصر حاضر کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے استدلال کیا جا سکے۔

مولانا تھانوی علم الاعتبار کے متعلق فرماتے ہیں:

اگر نص سے کسی معتبر دلالت کے ذریعہ حکم ثابت نہ ہو تا ہو لیکن نص کے جو معنی ہیں اس کے ساتھ کچھ مناسبت ومشابہت ہونے کی وجہ سے اس حکم کی طرف بھی ذہن متوجہ ہو تا ہو، پھر اگر یہ حکم خود مطلوب شرعی ہے اور کسی دوسری نص سے

۱۳- شاہ ولی اللہ، **الفوز الكبير في أصول التفسير** (مصر: دار الصحوة، ۱۹۸۶ء)، ۱۹۱۔

۱۴- شیر علی شاہ، **زبدۃ القرآن** (نوشہرہ: القاسم اکیڈیمی، ۲۰۰۴ء)، ۴۴۔

ثابت ہے تو اس کو علم الاعتبار کہتے ہیں اور بطور تشبیہ اس حکم کو اس نص کے تحت شامل کر سکتے ہیں اور یہ جائز ہے اور اگر یہ حکم شرعاً مطلوب ہی نہ ہو تو پھر اس کو آیت کے تحت شامل کرنا ناجائز ہے۔[۱۵]

اگرچہ صوفیہ کے ہاں متداول تفسیر اشاری میں بھی استدلال اعتبار کے اصول پر ہی ہوتا ہے، لیکن مولانا سندھی اور صوفیہ کے اس اعتبار میں فرق خاص وعام کا ہے۔ صوفیہ کے اشارات کا محور نفس وروح کی اصلاح اور تزکیہ ہوتا ہے، جب کہ مولانا سندھی قرآن پاک کی نصوص سے استدلال کو زیادہ وسیع کرتے ہوئے اس کا اطلاق نظم اجتماعی پر بھی کرتے ہیں: یعنی سیاست، معیشت اور سماجیات بھی اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا علم الاعتبار کی شرعی حیثیت بھی وہی ہوگی جو صوفیہ کے اشارات کی ہے۔ کیوں کہ دونوں میں اختلاف صرف اطلاقات کا ہی ہے۔

بیسویں صدی میں قرآن پاک کے تفسیری مناہج میں ایک اہم منہج نمایاں طور پر تفسیری افق پر نظر آتا ہے، جسے سائنسی تفسیر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر غایت نظر سے دیکھا جائے تو یہ بھی اشارات کے قبیل ہی سے ہے، اور اگر دور از کار تاویلات نہ ہوں تو اہل علم میں یہ طریقہ بھی متداول ہے۔

تفسیر إلهام الرحمان اور بیان القرآن کا ایک تعارف

تفسیر إلهام الرحمان کا تعارف

إلهام الرحمان في تفسير القرآن مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر ہے، جو انھوں نے اپنے شاگرد شیخ موسی جار اللہ[۱۶] کو املا کروائی۔ موسی جار اللہ کے ساتھ مولانا سندھی کی شناسائی روس میں ہوئی، جس وقت مولانا سندھی جلاوطنی کے بعد کابل سے ہوتے ہوئے ماسکو پہنچے۔ شیخ موسی جار اللہ نے مولانا سندھی سے ولی اللہی افکار سیکھے، جس سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ بعد میں دوسری دفعہ شیخ موسی جار اللہ کی مولانا سندھی سے مکہ مکرمہ میں ملاقات

۱۵۔ مفتی رضوان، **مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکر ولی اللہی کا نظریات کا تحقیقی جائزہ**، باب اوّل، رسالة التقصير في التفسير (راولپنڈی: ادارہ غفران، ۲۰۱۶ء)، ۲۶۔

۱۶۔ شیخ موسی جار اللہ کا تعلق روس سے تھا، انھیں روس کا شیخ الاسلام بھی سمجھا جاتا ہے۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ موسی جار اللہ نے بھی جلاوطنی کی زندگی گزاری، تین سال مکہ میں قیام کیا، ہندوستان بھی تشریف لائے، آخر کار ۱۹۴۹ء میں جب مصر میں تھے وہیں پر ان کا وصال ہوا۔ موسی جار اللہ کی کئی ایک تصانیف ان کی جلالت علمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں: **تاريخ القرآن والمصاحف، شرح ناظمة الزهر، نظام التقويم في الإسلام، نظام النسيء عند العرب، الوشيعة في نقض عقائد الشيعة.**

ہوئی، جہاں پر شیخ موسیٰ جار اللہ نے مولانا سندھی کے علوم سے استفادہ کیا۔ یہ قیام کوئی ایک سو پچاس دن پر محیط تھا، جس میں مولانا سندھی نے شیخ موسیٰ جار اللہ کو عربی میں قرآن پاک کی تفسیر املا کروائی، اس کلاس میں مولانا احمد علی لاہوری کے بھائی مولانا عزیز احمد بھی شریک رہے، جنھوں نے بعد میں موسیٰ صاحب سے یہ نسخہ حاصل کیا اور ہندوستان لے کر آئے۔ مولانا سندھی کے ایک اور شاگرد شیخ غلام مصطفیٰ القاسمی نے اسی نسخے کو سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الانفال تک تہذیب و تنقیح کے ساتھ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد سے شائع کروایا۔ یہی حصہ بعد میں اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اسی نسخے کی ایک کاپی ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری میں بھی موجود ہے، اور اس پر تاحال پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ چل رہا ہے۔ اس کا ایک نسخہ حیدر آباد یونیورسٹی کی ملکیت ہے، اور ایک نسخہ ملیشیا سے آئے ایک طالب علم عبد الکریم نے بھی کاپی کیا تھا۔

مولانا سندھی کے طرز تفسیر میں علم الاعتبار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی منہج تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ ابو الحسن علی ندوی کہتے ہیں:

> ان کی ذہانت و نکتہ آفرینی نے اس کی آیات وارشادات سے وہ کام لیا کہ ان کو اپنے ہر دعویٰ کی تائید قرآن مجید ہی میں نظر آنے لگی، اور انھوں نے اس سے اجتماعی و سیاسی زندگی کے ایسے ایسے اصول و کلیات اخذ کیے جن کا نہ کسی قدیم تفسیر میں نشان ملتا ہے، نہ کسی جدید تفسیر میں، یہ طرز استنباط اور یہ طریقہ تفسیر صوفیائے کرام کے تفسیری لطائف اور متصوفانہ نکات سے بہت ملتا جلتا تھا، جن کو وہ الاعتبار والتاویل کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن کے نمونے شیخ اکبر کی **فتوحات مکیہ**، علامہ مہائمی کی تفسیر، **تبصیر الرحمان و تیسیر المنان** اور علامہ حقانی کی تفسیر **روح البیان** میں دیکھے جاسکتے ہیں۔
>
> اگر اس کو تفسیر کا نام نہ دیا جائے اور "الاعتبار والتاویل" ہی کے نام سے یاد کیا جائے نیز وہ حد اعتدال سے متجاوز نہ ہو تو ہر دور کے علماء نے اس میں حرج نہیں سمجھا ہے، غرضیکہ مولانا عبید اللہ صاحب ایک خاص طرز تفسیر کے اس دور میں بانی تھے جس کو ان کے شاگرد رشید مولانا احمد علی صاحب تفسیر کے بجائے "الاعتبار والتاویل" ہی کے نام سے یاد کرنا پسند فرماتے تھے۔[١٧]

مولانا سندھی علم الاعتبار کو قرآن حکیم کی تفسیر کرتے ہوئے مرکزی حیثیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ قرآن حکیم ہر دور میں انسانوں کی کامل و مکمل زندگی کے لیے رہ نما ہے۔ اور اس کی ہر ہر آیت قابل عمل و قابل استدلال ہے۔ چناں چہ مولانا فقہا کے طرز تفسیر پر نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے ہمارے فقہاے احناف نے بے شک "اصول فقہ" میں قرآن کریم

١٧۔ ابو الحسن علی ندوی، **پرانے چراغ** (لکھنؤ: مکتبہ فردوس، ٢٠١٠ء)، ١: ١٢٠۔

کو پہلے درجہ پر رکھا تھا۔ لیکن عملاً وہ قرآنی مطالب کی بحث و تمحیص میں آیاتِ احکام سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ اوران کی ساری کوشش اس امر تک محدود رہتی تھی کہ قرآن کے صرف اوامر ونواہی پر بحثیں کریں۔ قرآن حکیم کو محض ان محدود معنوں میں قابل عمل سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام علمانے تمام قرآن کو سمجھنا ضروری نہ جانا اور آخر کار ہوا یہ کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گوافسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہا کا اس میں دخل نہ رہا۔[۱۸]

مولانا سندھی کے نزدیک قرآن حکیم کی کسی آیت کو کسی خاص زمانے میں مقید نہیں کیا جاسکتا، بلکہ عموم لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہر دور میں اس سے رہ نمائی لی جائے گی۔ چناں چہ اسباب نزول پر بحث کرتے ہوئے مولانا سندھی کہتے ہیں:

گو ائمہ فقہا نے "اصول فقہ" میں بالاتفاق اس امر کی صراحت کی ہے کہ اگر قرآن عظیم کی کوئی آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کی شان نزول کے متعلق کوئی خاص واقعہ ذکر کرتے ہوں لیکن قرآنی مطالب کی تشریح میں عمومیت ہی مد نظر رہے گی۔ اور کسی خاص شخص یا واقعہ سے اس آیت کو مخصوص کر دینا محل اعتبار نہ ہو گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قاعدے پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن ہمارے مفسرین کا یہ حال ہے کہ آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے متعلق ایک جزوی واقعہ مذکور ہو گا۔ مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے، یہ آیت عبداللہ بن ابی منافق کے بارے میں نازل ہوئی، یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں اتری، اس آیت میں اہل بیت کے فضائل کا بیان ہے۔ غرض قرآن کی آیات کو مخصوص اشخاص اور واقعات سے مختص کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ اساتذہ اور طلبہ کو انہی جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔[۱۹]

مولانا قرآن کریم کے منہج اصلاح و منہج تفہیم کو واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قرآن نے اصلاح کے لیے عرب کے خاص ماحول کو مد نظر رکھا، مگر اس طور پر کہ اس سے بدلتی ہوئی زندگی اور ہر موقع و زمانے کے لیے رہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مولانا سورۃ المجادلۃ کے شان نزول پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قرآن حکیم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ اجتماعی سیاسی امور کے سمجھانے کے لیے گھریلو واقعات کو عنوان بناتا ہے، کیوں کہ عرب اپنے گھر پر حاوی تھے۔ اگر ملک کو ایک بڑا گھرانہ فرض کر لیا جائے تو جو اصول تدبیر منزل

۱۸۔ عبید اللہ سندھی، **امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف**، ترتیب و تدوین، پروفیسر محمد سرور (لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۰۲ء)، ۴۵۔

۱۹۔ عبید اللہ سندھی، **شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ** (لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ۲۰۰۲ء)، ۴۶۔

میں کام دیتے ہیں وہی تدبیر ملک میں کام دے سکتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۲۱ تا ۲۴۲ کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے بہ طور تمہید لکھتے ہیں کہ:

صوفیہ کا قول ہے کہ "عالم شخص اکبر ہے اور انسان شخص اصغر" جو کچھ عالم میں ہے وہ سب کا سب ایک انسان میں موجود ہے۔۔۔اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے شک ایک کامل گھر وہ ہوتا ہے جس میں بیوی، بچے (مذکر و مؤنث) اور خدام زندگی کی آسانیوں کے لیے موجود ہوں، تو یہ شخص اصغر ہوگا اور ملک و قوم شخص اکبر۔ اور جو شخص گھریلو امور کے معاملات میں حسن انتظام پر قادر ہوگا تو اسے اگر ملک و قوم کے معاملات سپرد کر دیے جائیں تو وہ بھی احسن طریقے سے چلا لے گا۔[۲۰]

تفسیر بیان القرآن

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار برصغیر کی ان نابغہ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمہ جہت پہلوؤں سے دین کی خدمت کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف میں ایک کثیر تعداد میں کتابیں ہی نہیں لکھیں، بلکہ اپنے مواعظ سے ایک عرصے تک امت کی اصلاح کی ذمے داری بھی انجام دیتے رہے۔ **بیان القرآن** مولانا تھانوی کی تین جلدوں پر مشتمل تفسیر ہے۔ جس کے لکھنے کی وجہ بھی مولانا تھانوی نے مقدمے میں ذکر کی ہے، کہ:

بہت زور سے خود بھی اور احباب کے اصرار سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن کی لکھی جاوے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت دیکھ کر اس امر کو زائد سمجھتا تھا، اسی اثناء میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمہ شائع کرنے شروع کیے، جن میں بکثرت مضامین خلاف قواعد شرعیہ بھر دیے۔ جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت پہنچی ہے۔ ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان مضرتوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی مگر چوں کہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے وہ رسالے اس غرض کے لیے کافی ثابت نہ ہوئے تاوقتیکہ ابناء زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جاوے جس میں مشغول ہو کر ان تراجم مبتدعہ مخترعہ سے بے التفات ہو جاویں۔ ہر چند کہ تراجم و تفاسیر محققین سابقین کے بالخصوص خاندان عزیزیہ کے ہر طرح کافی و وافی ہیں مگر ناظرین کی حالت و طبیعت کو کیا کیا جاوے کہ بعض تفاسیر میں عربی و فارسی نہ جاننے کی مجبوری، بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع دلچسپی ہوا۔ تامل و مشورے سے یہی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جاوے جس کی زبان و طرز بیان و تقریر مضامین

۲۰۔ عبید اللہ سندھی، **إلهام الرحمان فی تفسیر القرآن** (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری)، ج۳، لوح ۷۰۔

میں ان کے مذاق وضرورت کا حتی الامکان پورالحاظ رہے اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزو قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو رہ نہ جاوے۔[۲۱]

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خود ہی مقدمے میں اس ترجمہ و تفسیر کے خصائص بھی بیان فرمائے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ عام فہم ترجمہ ہے جس میں تحت لفظ کی رعایت کی گئی ہے اور محاورات کے استعمال سے حد درجہ احتراز برتا گیا ہے۔ جہاں توضیح کی ضرورت پیش آئی وہیں "ف" لکھ کر توضیح کر دی گئی ہے۔ مفسرین کے اقوال کو جمع کرنے کے بجائے ترجیح کے اصول پر ایک کو ہی ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، اختلاف کی صورت میں مذہب حنفیہ کو لیا گیا ہے۔ نفع عوام کے ساتھ ساتھ اہل علم کے لیے، بلاغت، کلام، فقہ، نحو، صرف، اختلاف قراءات، اسباب نزول وغیرہ بھی ساتھ ہی مذکور ہیں، اور اس کی زبان بھی عربی اس لیے رکھی ہے کہ عوام کو اس کے دیکھنے کی ہوس ہی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ **مسائل السلوک من کلام ملک الملوک** علاحدہ سے مع اردو ترجمہ بھی شائع کی ہے۔ اور اس میں خاص وہ مسائل ہیں جو باعتبار وجوہ معتبرہ دلالت مدلول قرآنی ہیں۔[۲۲]

علم الاعتبار مولانا تھانوی کی نظر میں

مولانا تھانوی کی کتاب **مسائل السلوک في کلام ملک الملوک** دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ متن کا ہے جس میں وہ خاص مسائل ذکر کیے ہیں جو باعتبار وجوہ معتبرۂ دلالت مدلول قرآنی ہیں۔ دوسرا حصہ حاشیے کا ہے جس میں وہ مسائل ہیں جو درجۂ رموز و اعتبار میں ہیں جس کا استعمال باوجود ے کہ سلف سے بلکہ سنت سے بھی اس کی اصل ثابت ہے، جس کا استعمال صرف صوفیہ ہی کرتے ہیں، علما ظاہر میں یہ طریق مسلوک نہیں۔[۲۳] متن کا ترجمہ کیا گیا ہے جب کہ حاشیہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا، تاکہ عام لوگ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ اور یہی متن مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا حصہ بھی ہے۔

مولانا تھانوی کو اصول اعتبار کے عمومی استعمال پر شبہات تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے رسالے **التقصیر في التفسیر** میں کیا ہے۔ اور ان اعتراضات کا حاصل یہ ہے کہ:

۱۔ ایسا اعتبار جو حدود شرعیہ کے اندر نہ ہو، جس سے قرآن میں تغیر لازم آئے درست نہیں ہے۔

۲۱۔ اشرف علی تھانوی، **بیان القرآن** (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، س ن)، ا: ۷۔

۲۲۔ نفس مرجع، ا: ۱۰-۷۔

۲۳۔ اشرف علی تھانوی، **رفع الشکوک ترجمۃ مسائل السلوک** (دہلی: مالک کتب خانہ، ۱۹۱۹ء)، ۲، ۳۔

۲۔ تغیر لازم نہیں آتا، البتہ مدلول قرآنی پر وہی قیاس درست ہے جو مقصود دینی ہے اور جو قیاس مقصود دنیوی ہے اس کا درجہ فال متعارف یا شاعری سے زیادہ نہیں۔ اور حجت شرعیہ صرف قیاس فقہی ہے۔[۲۴] کیوں کہ قرآن مجید کی اصل غرض اصلاح معاد (یعنی آخرت کی اصلاح) ہے، عقائد صحیحہ و اعمال مرضیہ ظاہرہ (مثل نماز، روزہ، حج، زکوۃ، کسب حلال وغیرہ) وباطنہ (مثل حسد، تکبر، نفاق، ریا سے تزکیہ اور اخلاص، توکل، صبر و شکر کا حصول) سے، باقی معاش کا ایک حصہ بھی چوں کہ معین فی الدین ہے بقدر ضرورت اس سے بھی تعرض کیا گیا ہے، مگر نہ اس طرح کہ اس کے حاصل کرنے کی تدابیر بتلائی گئی ہیں، بلکہ اس طور پر کہ خاص حدود و قیود کے ساتھ اس کی تحصیل کی اجازت و ترغیب دی گئی ہے۔[۲۵]

۳۔ مولانا تھانوی کی تنقید میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جن مسائل کے بارے میں براہ راست قرآن پاک کی رہ نمائی موجود ہے ان میں دوسری آیات سے بتکلف اعتبار کی روشنی میں رہ نمائی حاصل کرنے کی روش درست نہیں ہے۔

اس لیے مولانا تھانوی فرد کی اصلاح کو مقصود سمجھ کر صرف اسی حد تک اس کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں جو مقصود دینی ہو، یا جس پر کوئی بڑا دینی مسئلہ موقوف ہو۔

دونوں تفاسیر کا تقابلی جائزہ

بحث کے اس حصے میں دونوں بزرگوں کی آرا کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور صرف ان آیات کا انتخاب کیا ہے، جو دونوں میں مشترک ہیں۔ کیوں کہ مولانا سندھی تفسیر کم اور اعتبارات زیادہ پیش کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس مولانا تھانوی نے بہت کم آیات کی تفسیر کے بعد اعتبارات پیش کیے ہیں۔

مثال نمبر ۱: سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۹: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ (اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص (حرام چیزوں سے) بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔)[۲۶]

۲۴۔ مفتی رضوان، **مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار**، ۸۶-۸۵۔

۲۵۔ نفس مرجع، ۴۰۔

۲۶۔ آیات کے تراجم مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر **بیان القرآن** سے نقل کیے گئے ہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس میں مذمت ہے تشبہ باہل باطل کی اگرچہ رسوم و عادات میں ہی ہو۔"(۲۷)

جب کہ مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں شمسی تقویم کو چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ وہ صابی مذاہب کے لائق ہے کہ وہ اختیار کریں۔ اور حنفی مذاہب اگر ملت کے معاملات کو شمسی تقویم کے مطابق انجام دیں تو گویا یہ گھر میں پیچھے سے داخل ہونے کے مترادف ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ایک قانون کی پابندی کرتا ہے۔ بہر حال اس کو ایک سے زیادہ قوانین کا مکلف ٹھہرانا خلاف فطرت ہے۔ انگریز کے ہم پر غلبہ کے بعد ہم مجبور ہوگئے کہ مسلط شدہ قوانین میں اسلامی قوانین کے ساتھ ساتھ مہارت حاصل کریں۔ نتیجے کے طور پر ہم دونوں میں ہی مہارت نہ پیدا کر سکے۔ اسی طرح سے معاملات کا حساب کتاب چاند کے مطابق ہو گا یا سورج کے مطابق، جب کہ چاند کے مطابق آسان ہے۔ اور ہم اپنے ملکوں میں دونوں تقویموں کو یاد رکھنے کی مشقت کو جانتے ہیں۔ اور یہی مراد ہے گھر کے پیچھے سے آنے سے، اور وہ ہے انسان کو تکلیف سے زیادہ کا مکلف ٹھہرانا۔(۲۸)

دونوں بزرگوں نے اس آیت کی تشریح علم الاعتبار کی روشنی میں بھی کی ہے۔ دونوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے اعتبار کا حاصل مسلمانوں کا الگ سے تشخص قائم رکھنا ہے۔ البتہ اس کے لیے دونوں کا طریقہ کار مختلف ہے۔ مولانا تھانوی برصغیر میں تصوف کے ایک بڑے شیخ کے طور پر متعارف تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے قارئین کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر اعتباری میں شخصی اصلاح اور انفرادیت کی طرف التفات کیا؛ جب کہ مولانا سندھی جب یہ تفسیر نقل کروا رہے تھے، اس وقت وہ خود اور ان کے تلامذہ بھی عالمی منظر نامے میں بدلتی ہوئی صورت حال کا بہ طور فریق مشاہدہ کر رہے تھے چناں چہ انھوں نے اعتبار میں اجتماعی قوانین میں اسلامی تشخص کو پیش نظر رکھا۔

اس طرح کے استدلالات سابقہ اہل علم کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ رئیس المفسرین امام رازی نے ابو مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس میں نسیٔ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں وہ حج کو اس کے متعین وقت سے آگے پیچھے کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر لیتے تھے، اور آیت کا یہ حصہ بھی اسی نسبت سے مذکور ہے۔(۲۹)

۲۷- تھانوی، **بیان القرآن**،۱: ۱۳۴۔

۲۸- سندھی، **إلهام الرحمان فی تفسیر القرآن**،ج۲،لوح۶۵۔

۲۹- رازی، **مفاتیح الغیب**،۵: ۲۸۷۔

یہ دلیل ہے کہ سابقہ مفسرین نے بھی اس فن اعتبار سے استدلال کیا ہے۔

مثال نمبر ۲: سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۷ : ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ﴾ (تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ” اس میں مجاہدہ کی تعدیل ہے۔“[۳۰] یعنی اللہ پاک نے مجاہدے میں نرمی کی ہے۔

جب کہ مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بعض لوگوں کے عورتوں کے ساتھ جماع کی خیانت کی وجہ سے نسخ واقع ہوا، اس کی حکمت یہ ہے کہ آدمی کا ذہن رات کو قرآن پاک کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے صاف ہو جائے۔ یعنی اگر اجازت نہ دی جاتی تو ہر وقت دماغ میں یہی وساوس رہتے۔ اس لیے اجازت دے دی گئی تاکہ فارغ ہو کر باقی وقت یکسو ہو کر قرآن پاک پڑھو اور سمجھو۔۔۔ روزے میں اصل یہ ہے کہ انسان پورا مہینہ روزہ رکھے، دن میں بھی اور اس کی راتوں میں بھی، رات کے وقت کھانے پینے میں رخصت انسان کی کم زوری کو مد نظر رکھتے ہوئے دی گئی ہے۔ اصل میں راتیں بھی روزوں میں داخل ہیں، پھر مفطرات کی رخصت عذر کی وجہ سے دی گئی ہے۔ پس اگر ہم رات کے روزے کو دیکھیں تو انسان سونے کے بعد مفطرات سے رک جاتا ہے، یہ ہے روزہ کا معنی۔ پس اگر مسلمان رات کو قرآن پاک میں تدبر کرتے ہوئے قیام کریں تو کیا یہ روزے کی بہترین تفسیر نہیں ہوگی؟[۳۱]

مولانا تھانوی اعتبار میں مجاہدہ کو اصل قرار دے کر اس میں رخصت کے قائل ہیں، جب مولانا سندھی تدبر قرآن کو اصل قرار دیتے ہیں، اور رات کے روزے میں رخصت کے قائل اس وجہ سے ہیں کہ ایک اور عظیم مقصد پیش نظر ہے۔

مثال نمبر ۳: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۹: ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجیے کہ جتنا آسان ہو۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس میں اصل ہے ذخیرہ نہ رکھنے کی (جیسا بہت سے بزرگوں کا مذاق ہوا ہے)۔[۳۲]

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت آیات قتال کے فوراً بعد مذکور ہے۔ اور دوام قتال کے لیے

۳۰- تھانوی، **بیان القرآن**، ۱: ۱۳۲۔

۳۱- سندھی، **إلهام الرحمان فی تفسیر القرآن**، ج ۲، لوح ۶۳۔

۳۲- تھانوی، **بیان القرآن**، ۱: ۱۵۴۔

اموال کی ضرورت ہوتی ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ضرورت کو باطل طریقے سے پورا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اور یہ سوال کہ کتنا خرچ کرنا چاہیے یہ اللہ پاک نے جہاد کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے عقل و بصیرت والوں پر چھوڑ دیا ہے کہ خود ہی متعین کر لو ضرورت کے پیش نظر۔ (۳۳)

یہاں مولانا تھانوی اس آیت سے ذخیرہ نہ کرنے اور اللہ کے راستے میں زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کے لیے استدلال اعتباری کرتے ہیں۔ جب کہ مولانا سندھی اس آیت کو تکمیلات جہاد اور ضروریات جہاد کو پورا کرنے میں معاون سمجھتے ہیں۔ اور جہاد مالی کے لیے استدلال کرتے ہیں۔ حاصل دونوں کا ایک ہے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا، فرق صرف انفرادیت اور اجتماعیت کا ہے۔

مثال نمبر ۴: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۶: ﴿**لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ**﴾ (جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں (کے پاس جانے) سے ان کے لیے چار مہینے تک کی مہلت ہے سو اگر یہ لوگ (قسم توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر لیں تب تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے رحمت فرماوینگے۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مراد رجوع الی النکاح ہے۔ پس یہ دال ہوا اس پر کہ نکاح منافی نہیں ہے درویشی کے۔ (۳۴)

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ: "قاعدہ کلیہ یہاں سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ حاکم یا تو اچھی طرح حکومت کرے اور چار مہینے غور کر کے اصلاح کرے، ورنہ چھوڑ دے۔ یعنی اگر حاکم ان شرائط کو فسخ کر ڈالے جو اس کے تقرر کے وقت طے ہوئی تھیں تو پھر اسے چار ماہ کی مہلت دی جائے گی۔ اس کے بعد جس طرح اس مرد سے قاضی جبراً عورت کو علیحدہ کر دے گا، اسی طرح جہاں جمہوری حکومت ہو گی وہاں رعایا خود فیصلہ کر کے حاکم پہ دباؤ ڈالے گی، کیوں کہ جس طرح مرد کو چار مہینے سوچنے کا حق دیا گیا ہے، اسی طرح حاکم کی مثال ہے۔" (۳۵)

اس آیت میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال درویشی پر ہے، جب کہ مولانا سندھی حکومتی بندوبست کے مسائل کو سامنے رکھتے ہو علم الاعتبار کی روشنی میں استدلال کر رہے ہیں۔

مثال نمبر ۵: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۱: ﴿**وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا**﴾ (اور ان کو تکلیف پہنچانے

۳۳۔ سندھی، مصدر سابق، ج ۲، لوح ۷۰۔

۳۴۔ تھانوی، مصدر سابق، ۱: ۱۶۱۔

۳۵۔ سندھی، **المقام المحمود**، ۱: ۲۱۳۔

کی غرض سے مت رکھو۔)

مولانا تھانوی ؒ فرماتے ہیں: اس میں اس پر دلالت ہے کہ جو امر مفضی الی المذموم ہو وہ مذموم ہے، چناں چہ امساک بغرض اعتدا سے نہی فرمائی، اور یہ تصوف کی فروع کثیرہ کی اصل ہے۔[۳۶]

مولانا سندھی ؒ ان آیات کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں: کہ یہ قانونی مثالیں اس لیے ذکر کی گئی ہیں تاکہ مسلمان ان مصالح کے استعمال پر قادر ہو جائیں جن کی اجتماعیت کے لیے رعایت ضروری ہے۔ ایسی اجتماعیت جس کی بنیاد قرآن میں حدود کے ساتھ مذکور ہے جو کہ قوموں کے مزاج کے مناسب ہے۔[۳۷]

مثال نمبر۶: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۵: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ﴾ (اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہو گا جو ان مذکورہ عورتوں کو پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃ کہو۔)

مولانا تھانوی ؒ فرماتے ہیں: اس میں اس پر دلالت ہے کہ امر بالمجاہدہ میں طالب کے ضعف کی رعایت ضروری ہے۔[۳۸]

مولانا سندھی ؒ قرآن پاک کی آیت ۲۳۴ اور ۲۳۵ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ: ہم ان احکام سے اعتبار کرتے ہیں انتقال حکم کا ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف۔ حاکم کے گھر میں بغاوت حاکم کو تبدیل کرنے کے لیے یا حکومت کو تبدیل کرنے کے لیے مخفی سازش پسندیدہ عمل نہیں ہے، لیکن حاکم کی وفات کے بعد، حقیقی ہو یا حکمی، اعلانیہ طور پر نمائندے کو امت یا قوم کے سامنے پیش کیا جائے گا، پس اگر وہ راضی ہوں تو پھر وہ حکومت کر سکے گا۔[۳۹]

مولانا تھانوی ؒ ان آیات سے اعتبار قائم کر رہے ہیں مشائخ تصوف کے لیے کہ وہ طالبان حق کو مجاہدات کرواتے ہوئے ان کے نفس کی قوت و ضعف کا لحاظ رکھیں۔ جب کہ مولانا سندھی ملی معاملات میں حکم ران اور عوام کے درمیان تعلقات میں اعتماد، اعتدال اور احسان پر اعتبار قائم کر رہے ہیں۔

مثال نمبر۷: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۱: ﴿إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ...﴾ (اگر تم ظاہر کر کے دو صدقوں کو تب بھی اچھی بات ہے۔ اور اگر ان کا اخفا کرو اور

۳۶- تھانوی، مصدر سابق، ۱: ۱۶۷۔

۳۷- سندھی، **إلهام الرحمان**، ۱: ۷۵۔

۳۸- تھانوی، مصدر سابق، ۱: ۱۷۰۔

۳۹- سندھی، **إلهام الرحمان**، ۳: ۷۷۔

فقیروں کو دے دو تو یہ (اخفا) تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔)[۴۰]

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس میں یہ مسئلہ ہے کہ عمل کے اعلان و اخفا میں اختیار ہے، اور ساتھ ہی اخفا کی افضلیت بھی ہے جب اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۲: ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ...﴾ (ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمے (فرض واجب) نہیں۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس میں اس پر دلالت ہے کہ کسی کے زیادہ درپے نہ ہو اور تدبیر میں زیادہ مبالغہ نہ کرے کیوں کہ عدم تصدق علی الکفار کا بطور تدبیر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا تھا۔[۴۱]

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۲: ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ...﴾ (اور جو بھی تم خرچ کرو گے بھلائی (مال) پس تمھاری اپنی جانوں کے لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہوئے۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس میں دلیل ہے اس پر کہ ثواب کا قصد کرنا خلوص للہ کے منافی نہیں جیسا بعض جہلا صوفیہ نے سمجھا ہے، چناں چہ آیت میں دونوں قصد کو جمع فرمایا ہے۔"[۴۲]

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ آیت نمبر ۷۰ سے ۲۷۴ تک کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اموال اور حکمت کا انفاق خلافۃ اللہ کے قیام کے لیے قرآن کا مقصود ہے۔[۴۳]

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات سے عمل میں اخلاص قلبی کے لیے اعتبارات قائم کیے ہیں، جب کہ مولانا سندھی خلافت کے قیام کے لیے مال کے خرچ کرنے کے جذبے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مثال نمبر ۸: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ (اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین تک (کے لیے) تو اس کو لکھ لیا کرو۔)

۴۰۔ تھانوی، مرجع سابق، ۱: ۱۹۷۔

۴۱۔ تھانوی، مرجع سابق، ۱: ۱۹۷۔

۴۲۔ تھانوی، مرجع سابق، ۱: ۱۹۷۔

۴۳۔ سندھی، **إلهام الرحمان**، ۳: ۸۷۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اس میں ثبوت ہے اس کا کہ معاشرت و عادات کے نظام کی اصلاح طریق کے منافی نہیں ہے۔[۴۴]

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ جو لوگ قرض کے لین دین کا معاملہ کرتے ہیں ان کے لیے لکھنا پڑھنا سیکھنا ضروری ہے۔[۴۵]

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشائخ طریقت اگر معاشرت و عادات کی اصلاح کریں تو یہ طریقت کے خلاف نہیں ہے۔جب کہ مولانا سندھی اسی آیت سے یہ اعتبار قائم کرتے ہوئے لکھنے پڑھنے کو مالی لین دین کرنے والوں پر لازم قرار دیتے ہیں، جو کہ تقریباً معاشرے کے ہر فرد کو کرنا پڑتا ہے، تو گویا کہ ان کے نزدیک معاشرے کے ہر فرد کے لیے لکھنا پڑھنا لازمی ہے۔

مثال نمبر ۹: سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵:﴿**وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا**﴾(اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جن کو خدا تعالیٰ نے تمھارے لیے مایۂ زندگانی بنایا ہے اور ان مالوں میں سے ان کو کھلاتے رہو پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہتے رہو۔)

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس سے یہ قاعدہ مستنبط ہوتا ہے کہ کوئی چیز غیر اہل کے سپرد نہ کی جاوے اور اموال پر مناصب کو بھی قیاس کریں گے، اور منجملہ مناصب کے طالبین کی تعلیم و تربیت کی خدمت ہے، سو کسی کو ماذون (خلیفہ) بنانے میں نہایت احتیاط چاہیے اور جس طرح اموال کے بارے میں **وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى** میں جانچ کرنے کا حکم ہے اسی قیاس پر اس کے منصب کے بارے میں بھی بدرجہ اولی امتحان کرنا ضروری ہو گا۔[۴۶]

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اجتماعیت اموال کے ساتھ ہی قائم ہوتی ہے۔ اور جو آدمی درآمدات و برآمدات میں توازن پیدا کرنے کے لیے حساب کتاب نہیں کر سکتا وہ سفیہ ہی کہلائے گا اور ایسے آدمی کو اموال کا نگہبان نہیں بنایا جاسکتا؛ کیوں کہ شخصی اموال بھی قوم کا مال ہی ہوتا ہے۔ اور قوم اپنے افراد کی حفاظت کرتی ہے۔ پھر گلہ کرتے ہیں کہ مسلمان اقوام کیسے بادشاہوں کی اولاد کے سپرد نظام مال کر دیتی ہیں، جب کہ یہ صریح قرآن کے خلاف ہے۔

۴۴۔ تھانوی، مرجع سابق،۱: ۲۰۴۔

۴۵۔ سندھی، **إلهام الرحمان**،۳: ۸۸۔

۴۶۔ تھانوی، مصدر سابق،۱: ۳۲۹۔

پھر اس سے اگلی آیت ''فَإِنْ آنَسْتُمْ'' (پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو) سے امتحان ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی منصب مثلاً مدرس، قاضی امام وڈیرہ کو کسی بھی منصب پر بٹھانے سے پہلے اس کا امتحان ضرور لینا چاہیے۔(۴۷)

اس آیت میں دونوں بزرگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی نااہل شخص کو کوئی عہدہ و ذمہ داری نہیں دینی چاہیے۔ آگے چل کر مولانا اشرف علی تھانوی نے اس میں بہ طور خاص مشائخ تصوف کی طرف سے مقرر کیے جانے والے نائبین و خلفا کا ذکر کیا ہے کہ ان کو مقرر کرنے میں احتیاط ہونی چاہیے، جب کہ مولانا سندھی نے منصب کو عام رکھتے ہوئے چھوٹے مناصب سے لے کر بڑے مناصب تک سب کو شامل کر دیا کہ ہر منصب اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور اہلیت کو جانچنے کے لیے مروجہ امتحانات کا طریقہ بھی قرآنی حکم کا مصداق ہے۔

نتائج بحث

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ دونوں ہی تفسیر میں علم الاعتبار کے قائل ہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علم الاعتبار کو محدود کیا ہے فرد کی اصلاح کے لیے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ معاشرتی عادات ورسوم کی اصلاح کے لیے بھی بسا اوقات اعتبار قائم کرتے ہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اعتبار کے لیے قوی مناسبت ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دینی و دنیاوی امور کی تفریق کرتے ہیں، اسی لیے وہ دینی امور میں قیاس فقہی کے قائل ہیں، جب کہ دنیاوی امور میں اس کو جائز نہیں سمجھتے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ علم الاعتبار کے استعمال میں توسع کے قائل ہیں۔

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ زندگی کے تمام مسائل کے لیے علم الاعتبار کا استعمال کرتے ہیں

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ بسا اوقات دور کی مناسبت کو اختیار کرتے ہوئے علم الاعتبار کو استعمال کرتے ہیں۔

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ انفرادی اصلاح کی بجائے زیادہ توجہ اجتماعی امور کو دیتے ہیں اور ان کے لیے علم الاعتبار سے استدلال کرتے ہیں۔

۴۷۔ سندھی، **إلهام الرحمان**، ۳: ۱۲۴۔ ۱۲۵۔

دراصل مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ دونوں ہی جمہور علماے اہل سنت کے مسلک کی پیروی کرتے ہیں۔ البتہ دونوں کا میدان عمل الگ الگ ہے، اس لیے دونوں نے علم تفسیر میں اپنے خاص حالات وضروریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور یہ ایک طبعی بات ہے کہ انسان کی سوچ پر اس کے حالات اور دائرۂ کار کا اثر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اصولاً متفق ہونے کے باوجود بھی جزئیات میں دونوں بزرگوں کے درمیان اختلافات واقع ہوئے ہیں۔